Name of Journal: Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal Education & Research
Vol. 3 No.1 (2025)

A Symbolic Study of the Short Stories of Mansha Yad

منشایاد کے افسانوں کا علامتی مطالعہ

Dr. Uzma Noor
Govt Girls High School, ARL Morgah, Rawalpindi
Ghazala Kishwer
Lecturer, Urdu Department, Thal University, Bhakkar
Dr. Mamuna Subhani
Associate Professor, Urdu Department G.C University, Faisalabad. memunasubhani@gcuf.edu.pk

Abstract
Muhammad Mansha Yaad is a famous Urdu & Punjabi short story writer. He write Novel in Urdu and Punjabi also. He is a famous T.V drama writer. He is an introvert in his short stories. His short stories comprises multi-dimensional meanings. To attain this purpose, he writes in Symbolic style also. This article attempts to analyze his short stories in the perspective of symbolism. Sometimes he used concrete symbols and sometimes abstract way of writing. His Symbols are neither so easy, nor so difficult to understand. He chooses them from real life, society, folklore, literary traditions and Punjabi culture. He used these symbols to express his inner feelings, self-actualization and psychological issues in our society. These symbols are very from each other and demands deep intention to understand them.
Key Words: Muhammad Mansha Yaad, Urdu & Punjabi short story writer, multi-dimensional, real life, society, folklore, literary traditions and Punjabi culture, self-actualization, psychological issues.

AL- ANFAL
SLOGAN HERE
Name of Journal: Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal Education & Research
Vol. 3 No.1 (2025)

"پے انگ گیسٹ" ایسا افسانہ ہے جو ایک چونکا دینے والی کہانی ہے۔افسانے کے کرداروں میں وہ، بیگم حمید اور اُس کی تین بیٹیاں ہیں۔ افسانے کا واحد مذکر مرکزی کردار اپنے گھر میں ایک مہمان کی طرح رہتا ہے اور گھر کے افراد ایک بیگم اور تین بیٹیاں بھی اُسے مہمان بجھتی ہیں۔حمید صاحب اپنے ہی گھر میں تنہائی اور اکیلے پن کا شکار ہے۔

مظفر علی سید لکھتے ہیں:۔

> "پے انگ گسیٹ" کے حمید صاحب جو اپنی بیوی کو لینڈ لیڈی بتاتے ہیں اور بیٹیوں کو غیر کی نظر سے دیکھتے ہیں،ایک استحصال زدہ صاحب خانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی اپنی صورت حال کے لئے ذمہ دار ہیں۔"(۶)

دراصل مغرب کی اندھا دھند تقلید سے ہماری مشرقی گھریلو زندگی بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے اس تقلید نے ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے افراد کے درمیان اجنبیت کی ایسی نہ نظر آنے والی دیوار کھڑی کر دی ہے جس سے گھر کی فضاء تناؤ کا شکار ہوئی ہے۔حمید صاحب بھی اسی تناؤ کا شکار ہو کر اپنے ہی بال بچوں سے اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔کہانی کا آخری جملہ قابل غور ہے جو مسز حمید کے منہ سے ادا ہوا ہے۔ورنہ تو ساری کہانی حمید صاحب کے نقطہ نظر سے بیان ہوئی ہے۔

" شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہو گئی مگر آپ کو کچھ فکر نہیں"

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:۔

> "منشایاد کے افسانوں میں جادو گری کے مظاہرے قدم قدم پر ملتے ہیں۔اس سلسلے کا شاید سب سے خوبصورت افسانہ " پے انگ گسیٹ" ہے جو نہ صرف اُردو کے ناقابل فراموش افسانوں میں شامل ہونے کے قابل ہے بلکہ منشایاد کے فن کا بھی ایک اعلیٰ نمونہ ہے"۔(۷)

بانجھ ہوا میں سانس، نیم علامتی افسانہ ہے اس کہانی میں منشایاد نے سنگین مسائل، جو اس معاشرے کو درپیش ہیں، کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ماحولیاتی آلودگی آج کے دور کا سنگین ترین مسئلہ ہے۔ جہاں کھانے پینے اور استعمال کی دور ہے۔پینے اور ہر چیز میں ملاوٹ ہے وہاں اگر ہوا میں بھی زہریلی گیسوں کی ملاوٹ ہو گئی یا پھر ہوا سے خالص ترین مواد نکال لیا گیا تو کیا ہو گا؟ وہی جاگیر درانہ نظام کا جبر، طبقاتی تقسیم، اور طاقت کی اجارہ داری اس افسانے کا موضوع بنتی نظر آتی ہے۔ کھانے پینے کی ہر چیز میں ملاوٹ، دوائیوں میں ملاوٹ،پٹرول میں ملاوٹ حتیٰ کے ہوا جو قدرت کا انمول عطیہ ہے اس میں بھی انسان کی کارگزاری سے ملاوٹ ہو گئی ہے اور سب سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ کھائے پیئے بغیر انسان ہفتہ دو ہفتے رہ سکتا ہے جبکہ ہوا کے بغیر چند لمحے نہیں گزار سکتا ہے۔کہانی کا کردار فتے اپنے گھر میں سویا ہوا سوتی جاگتی اور خواب کی کیفیت میں سانس کی تنگی کا شکار ہے۔ جس سے اس کا دم گھٹا جارہا ہے۔دم گھٹنے سے

Name of Journal: Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal Education & Research
Vol. 3 No.1 (2025)

اس کے گلے سے عجیب و غریب قسم کی آواز میں نکلتی ہیں وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ فتے کا سانس پھولا ہوا ہے۔ وہ ہانپ رہا ہے اور ہانپتے ہوئے اپنے بیوی بچوں کو پکارنے لگاتا ہے جو گھر کی چھت پر سوئے ہوئے ہانپ رہے ہیں۔ اور سانس کی تنگی کی وجہ سے اپنی اپنی چار پائیوں پر نیم مردہ حالت میں پڑے ہیں۔ پھر وہ اپنے آپ کو بڑے ملک کے سامنے کھڑے ہوئے پاتا ہے۔ فیتا اسے بتاتا ہے کہ اس نے اپنا اور اپنے خاندان کا نام رجسٹر نہیں کروایا۔ فیتا ملک کے سامنے گڑ گڑاتا ہے کہ اسے ہوا دی جائے۔

داری فتے کی جوان بیٹی ہے اور ملک اس پر بری نظر رکھتا ہے۔ فیتا داری والی شرط مان لیتا ہے اور اپنے خاندان والوں کے لیے گیس کے تین سلنڈر لے جاتا ہے۔ اس طرح مجبوری ایک غریب شخص کو بیٹی کی عصمت کا سودا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

''اندھیرے سے اندھیرے تک'' میں روایتی کہانی کے انداز اور علامتی پیرائے میں اس شہر کا قصہ بیان ہوا ہے جہاں حالات بتدریج بدلتے چلے جاتے ہیں۔ اس شہر کے لوگ روپے پیسے کو عزیز رکھتے ہیں پھر اس شہر پر نوٹوں کی بارش ہوتی ہے سمیٹنے والے سارے نوٹ سمیٹ لے جاتے ہیں۔ اور جو بچ جاتے ہیں وہ کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جو خرید سکتے ہیں وہ بازار کی ہر چیز خرید لیتے ہیں یہاں تک کے ساری دکانیں خالی ہو جاتی ہیں اور جب خریدنے کے لیے کچھ نہیں بچتا تو پھر ایمان، اخلاق اور عصمتیں خریدتے ہیں اور آخر کار بیچنے والے خود بکنے لگتے ہیں اور بکنے والے اپنی دکانوں کے تھڑوں پر آکر بیٹھ جاتے ہیں اور گاہکوں کی ہر جائز و ناجائز ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ پھر سورج کی روشنی میں چمک کم ہوگئی دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہو گئیں۔ ایک بار پھر شہر پر نوٹوں کے بجائے پتھروں کی بارش ہوئی۔ شہر تباہی کا شکار ہو گیا ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ سورج چاند ستارے سب ماند پڑ گئے اور روشنی کا ایک واحد تنہا سا نقطہ '' جگنوان کا سورج اور چاند ٹھہرا۔ افسانہ نگار نے اس افسانے میں علامتی اور استعاراتی انداز میں معاشرے میں موجود ناانصافی کو بیان کیا ہے ہر جائز و ناجائز ذرائع سے دولت اکھٹے کرنے والوں کا انجام آخر کار اندھیرا ہی ہوتا ہے۔ اور اندھیرے سے اندھیرے تک ایک بلیغ اشارہ ہے کہ بدی ہوتے ہوتے بد اور بدترین ہو گئی ہے۔ لیکن ختم نہیں ہوئی۔

زوال کے اسباب'' میں تباہ حال شہر کے زوال کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ماہرین کی ایک کمیٹی شہر کے تباہ ہونے کے اسباب اکھٹے کر رہی ہوتی ہے تو ان پر انکشاف ہوتا ہے کہ اس شہر کے لوگ لوٹ مار اور چوری کی وارداتیں کرتے تھے۔ سال بھر کا غلہ بینکوں میں جمع کرا دیتے تھے۔ مگر اس غلے کو نکلوانے کے لیے بنک اہل کاروں کو رشوت دینا پڑتی اس سارے عمل میں کئی کئی دن لگ جاتے۔ تب تک وہ غذائی اجناس بھی گل سڑ جاتیں اور اس غلے کے مالک بھوک سے مر جاتے۔ ابھی ماہرین اس انکشاف کی چھان بین میں لگے ہوئے تھے کہ دوائیاں موجود ہوتے ہوئے بھی لوگ کیوں ہلاک ہو گئے تھے کیا دوائیوں کی بھی ذخیرہ اندوزی کی گئی تھی۔ جو لوگ دوائی خریدنے کی سکت نہیں رکھتے تھے وہ تڑپ تڑپ کر مر گئے اور ابھی موجودہ دونوں امور زیر بحث تھے کہ ماہرین پر ایک اور انکشاف ہوتا ہے۔

انسانی کھوپڑیوں کے جو مختلف نمونے ملتے ہیں ان کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ہر صدی کے لوگ جو ذہنی طور پر ایک دوسرے سے مختلف تھے مگر جسمانی طور پر ایک ہی عہد میں رہ رہے تھے۔ماہرین کا خیال ہے کہ اگر اسی ایک نکتے کا پتہ چل جائے تو شہر کے زوال کے اسباب جانے میں کامیابی ہو جائے گی۔افسانہ نگار نے اس افسانے کے ذریعے سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ دور میں رہنے والے انسانوں میں گزشتہ تمام ادوار کے لوگوں کی برائیاں پائی جاتی ہیں گزشتہ قومیں اپنے جن جن اعمال کی وجہ سے تباہی کا شکار ہوئیں اور عذاب الہی میں مبتلا ہوئیں وہ تمام برائیاں آج کے دور کے انسان میں آن موجود ہوئی ہیں۔

افسانہ خواہشیں سراب ہیں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان کی زندگی عارضی اور بہت قلیل مدت پر محیط ہے اور انسان اس مختصری زندگی کو اپنی خواہشات کی تکمیل میں گزار دیتا ہے آخر زندگی ختم ہو جاتی ہے۔اور اس زندگی کا اصل مقصد حاصل نہ کر سکنے کی وجہ سے پچھتاوؤں کا شکار ہو جاتا ہے۔یہ افسانہ اپنے اندر گہرے معنی رکھتا ہے۔یقیناً ہر شخص اپنی زندگی کا قیمتی وقت فضول ضائع کرنے کے بعد اپنی موت کے وقت ایسے ہی اللہ تعالی سے گڑگڑا کر وقت مانگ رہا ہو گا،ایک اور زندگی مانگے کا مرتب وقت ختم ہو چکا ہو گا جو کسی صورت واپس نہیں ملے گا۔یہ افسانہ بھی ایک ایسے ہی شخص کی کہانی ہے جو اپنی زندگی کی کسی حالت سے خوش نہیں ہے۔وہ اپنی زندگی میں ان دنوں کا شمار نہیں کرانا چاہتا جن میں وہ خوش نہیں تھا۔یا اس کی مرضی شامل نہیں تھی۔بیرونی دنیا سے مایوس ہو کر اپنے تخیل میں پناہ لیتا ہے۔ایک ماں اور بچے کا تصور اس کے ذہن میں ابھرتا ہے۔

اپنی نوعیت کا یہ ایک منفرد افسانہ ہے۔جس میں حقیقت کے ساتھ ساتھ ہماری معاشرتی برائیوں پر گہرا طنز بھی ملتا ہے۔فرد جو فطرتاً آزاد ہے۔ہماری معاشرتی رسم ورواج کی حد بندیوں میں اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ زندگی اس کی ہوتی ہے مگر اس زندگی کو اس کی مرضی کے بغیر گزارتا کوئی اور ہے۔تو پھر انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ اپنے لیے جینے کے لیے کچھ ٹائم اور دیا جائے۔

بچھڑے ہوئے ہاتھ سقوط مشرقی پاکستان کے تناظر میں لکھا گیا افسانہ ہے۔منشا یاد نے سقوط مشرقی پاکستان پر جو کہانیاں تحریر کی ہیں وہ ایک بچے وطن پرست کے جذبات کا اظہار ہیں۔ان کی کہانیاں صرف حال کی روداد نہیں بلکہ وہ حال کو ماضی اور مستقبل کے ساتھ جوڑ کر شعور کی رو کی تکنیک کے ذریعے ایک ایسی دنیا کو سامنے لاتی ہیں جو ہمارے عروج وزوال کی داستان سناتی ہے۔منشا یاد نے پاکستان کو ایک جسم سے تشبیہ دی ہے۔اور ایک جسم سے اس کا کوئی اعضاء الگ ہو جائے تو اس کمی کو وہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔ایسے ہی پاکستان کے لیے مشرقی پاکستان کی علیحدگی ایک ایسی ہی کمی ہے جو ہمیشہ شدت سے محسوس ہوتی رہے گی۔اپنے ہاتھوں پر اس کی بے شمار یادیں نقش تھیں۔

افسانے میں جدید سرجری کے کرشماتی کارنامے کو بھی بیان کیا گیا ہے۔جہاں پیوند کاری کے ذریعے ایک انسان کے جسم کا کوئی بھی حصہ دوسرے انسان کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔اس کہانی میں بھی اس کے سر کے ساتھ ''ب'' کا جسم جوڑ دیا گیا ہے۔اور اس کا اپنا جسم کسی قبر کی کھائی میں پڑا ہے۔وہ اپنے جسم کی کمی کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور ساتھ ہی کسی اور کے جسم کے ساتھ جڑ کے جو اس

Name of Journal: Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal Education & Research
Vol. 3 No.1 (2025)

کی ذہنی کیفیت اور احساس اور جذبات ہیں اُن کو بھی بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ کسی اور کے جسم کے ساتھ رہتے رہتے وہ اپنائیت کے جذبات سے عاری ہو گیا ہے

افسانہ ” خواب در خواب ‘‘میں کہانی کا آغاز سورہ واقعہ کی چند آیات کے ترجمے سے ہوتا ہے۔ان آیات میں دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال رکھنے والوں کے درجات کا ذکر کیا گیا ہے۔اللہ تعالی اہل ایمان کو جنت کی خاص نعمتوں سے نوازیں گے۔ پھر کہانی شروع ہوتی ہے۔ وہ گرم زمین پر قدم رکھتا آگے بڑھتا ہے تو اسے سب سے پہلے شدو مہترانی نظر آتی ہے جس نے غلاظت سے بھرا ٹوکرا سر پر رکھا ہوا ہے اور بدبو سے بے نیاز چلی جارہی ہے۔ پھر پیرو جو ایک بھانڈ کا بیٹا ہے۔اپنے باپ کی خواہش پر گاؤں بھر میں ناچتے گاتے جوان ہو گیا ہے۔اب اسے اپنی ہم عمر لڑکیوں کے سامنے ناچتے گاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ وہ آگے بڑھتا ہے تو اسے صادو ترکھان کی کتا کھانسی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جو اسے لکڑیوں کا برادہ پھانکتے پھانکتے ہو گئی تھی۔ یہ مولوی فلک شیر ہے جو لوگوں کو صراط مستقیم پر لانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اب بڑے ملک کو قصہ سنانے کی ڈیوٹی نبھا رہا ہے۔اسے گاؤں کے بہت سے لوگ ملتے ہیں اپنے وزن سے دگنا بوجھ اٹھائے وہ سب کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا گاؤں کے آخری آدمی باقی مسلّی کو دیکھتا ہے جو بھری دوپہر کو بالکل خالی میدان میں مرے ہوئے جانوروں کی ہڈیاں اکٹھی کر رہا ہے۔ وہ دھوپ سے بچتا اور تقریباً بھاگتا ہوا بڑے ملک کی حویلی میں داخل ہوتا ہے جہاں چمکتی ہوئی گاڑیوں کی لائن لگی ہے ڈرائیور خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ وہ اندرونی گیٹ میں داخل ہوتا ہے تو حویلی کا اندرونی حصہ جنت کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ میزبان خواتین خوش لباس، خوش شکل، باوردی ملازم، ٹرے میں اٹھائے ہوئے طرح طرح کے لوازمات، اچانک اُسے چیزیں ڈبل دکھائی دینے لگتی ہیں جس کا حل وہ اپنی ایک آنکھ بند کر لیتا ہے اور دوسری آنکھ سے دیکھتا رہتا ہے۔ آسائش کی ہر چیز موجود گھر دنیا میں ہی جنت کا نظارہ پیش کر رہا ہوتا ہے۔ جب دیکھتے دیکھتے آنکھ تھک جاتی ہے تو وہ اپنی بند آنکھ کو کھولتا ہے دیکھنے کے لیے مگر اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔اس افسانے میں طبقاتی معاشرے کی زندگی کے دو رنگ دکھائے گئے ہیں۔ایک وہ جو زندگی کو مر مر کر جیتے اور ایک وہ جو سامان فراواں کیساتھ اس مادی دنیا میں ہی جنت کا مزہ لوٹتے ہیں جنت اور جہنم کسی نے نہیں دیکھی مگر جو شکر دوپہر میں محنت مزدوری کر رہا ہے اس کے لیے یہ زندگی ہی جہنم ہے۔اور جو موسموں کی سختی سے بے نیاز خود کشید کردہ موسم کے مزے لیتا ہے اس کے لیے یہ زندگی جنت کا نمونہ ہے۔

رکی ہوئی آوازیں اپنے دور کے سیاسی جبر اور مارشل لاء کے خلاف احتجاج کی کہانی جو آزاد نظم کی ہیت میں لکھی گئی ہے۔ علامتی اور تجریدی اسلوب سے کہانی میں گہری معنویت در آئی ہے۔ کہانی ایسے شخص کی ہے جس کے باپ دادا نے ایک پختہ مکان بنایا اپنی اولاد کے لیے اور اولاد کی اولاد کے لیے مگر اس پر غاصبوں نے قبضہ کر لیا وہ اس مکان کے ایک کونے میں پڑا رہتا ہے۔اسے کھانے کو باسی کھانا دیا جاتا ہے۔

AL- ANFAL
SLOGAN HERE
Name of Journal: Al-Anfal
AL- ANFAL
SLOGAN HERE
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal Education & Research
Vol. 3 No.1 (2025)

عالی شان پختہ مکان سے مراد ملک پاکستان ہے۔اور وہ یتیم بچہ جس سے وہ مکان چھین لیا گیا ہے پاکستان کی غریب عوام ہیں۔مکان کے مالک بدلتے رہتے ہیں۔دراصل ملک کے حکمران بدلتے رہتے ہیں مگر اس مکان میں رہنے والے یتیم بچے کی طرح عوام کی بھی حالت نہیں بدلتی وہ جوں جوں خراب ہوتی جاتی ہے۔پھر وہ یتیم بچہ اپنی حالت بدلنے کا راستہ نکال لیتا ہے وہ باسی روٹی کھانے کے بجائے اڑتے پرندوں کا شکار اور درختوں سے لذیذ پھل اتار لیتا ہے۔اور ظلم کرنے والوں کے خلاف اپنے اندر برسوں کی رُکی آوازوں کو نکالنا چاہتا ہے۔

جہاں تک اس افسانے کے اسلوب کا تعلق ہے تو منشایاد نے جدید افسانوی اسلوب، جس میں عدم تکمیلیت،ابہام،اشاریت اور علامیت کا غلبہ ہے کو بروئے کار لایا ہے۔منشایاد نے اس افسانے میں تجریدی کیفیات و احساسات اور نکھلتے جذبوں کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔متکلم کی ذہنی و نفسیاتی نفسی حالت میں تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔اور اسلوب میں شعری عناصر کی موجودگی نے اسے نثری نظم کے قریب کر دیا ہے۔حیدر قریشی لکھتے ہیں:

> ”رکی ہوئی آوازیں،الہامی کتابوں کے اُسلوب میں لکھا ہوا اُس شخص کا افسانہ ہے جس کے دو منزلہ گھر کی چھت اور ملبہ اکھاڑ لیا گیا اور وہ آدھا رہ گیا۔مگر وہ بے بس اور نحیف تھا اور احتجاج تک نہ کر سکتا تھا۔“ (۸)

۱۹۷۸ء کا آخری افسانہ،پناہ،اس مجموعے کا انیسواں اور آخری افسانہ ہے۔افسانے میں ایک ایسے شخص کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔جو مارشل لاء کے جبر اور سیاسی ابتری کے عذاب میں مبتلا ہے۔ حبس اور جبر کی فضا جو آمریت کی پیدا کردہ ہے، مارشل لاء جمہوریت کی تباہی اور فرد واحد کی خود اختیاری ہے۔افسانے کا بے نام کردار گھر سے بے مقصد نکلتا ہے اور نامعلوم طریقے سے جلوس میں شامل ہو جاتا ہے۔ ہجوم کے ساتھ چلتے چلتے اچانک اُسے خیال آتا ہے کہ یہ جلوس کس سلسلے میں ہے۔یہ جلوس ہے یا کسی کا جنازہ جا رہا ہے یا شاید یہ بارات ہے۔اسی سوچ میں گم وہ اپنے ارد گرد کا جائزہ لیتا دوبارہ ماتم کرتے جلوس میں شامل ہو جاتا ہے۔

افسانے کا کردار اپنے موجودہ حالات سے گھبرا کر اپنے تخیل میں پناہ لیتا ہے مگر اس کی نفسیاتی حالت ایسی خراب ہے کہ اسے اپنے تخیل میں بھی چین نصیب نہیں ہوتا۔اور حالیہ صورت حال میں وہ ہڑ بڑا جاتا ہے۔ بیانیہ اسلوب میں بیان کیا گیا یہ افسانہ اپنے اندر علامتی در و بست لیے ہوئے ہے۔افسانہ نگار نے اپنے دور کی بہترین عکاسی کرتے ہوئے ماحول کے مطابق تمام جزئیات کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔اس افسانے کی فضاء میں ۱۹۷۷ کے بعد چھانے والی تاریکی کو قاری کسی خارجی سہارے کے بغیر دور پیچھے تک ۱۹۵۸ء تک اور آگے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے گزر کر اگست ۲۰۰۸ء تک مسلط دیکھ سکتا ہے۔

حیدر قریشی لکھتے ہیں:

Name of Journal: Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal Education & Research
Vol. 3 No.1 (2025)

۱۹۷۸ء کا آخری افسانہ، پناہ، ۱۹۷۸ء کی سیاست کی خونخواری اور سفاکی سے بناہ مانگتا افسانہ ہے۔" (۹)

اس مجموعے کے افسانوں میں چند ایسی خوبیاں ہیں جنہیں اردو افسانہ میں صرف منشا یاد کے ساتھ ہی منسوب کیا منشا یاد جا سکتا ہے۔ مثلا حسب ضرورت پنجابی الفاظ اور پنجابی ماہیے اور گیتوں کا تخلیقی استعمال ایسے کر جاتے ہیں کہ وہ اردو افسانے میں اجنبی محسوس نہیں ہوتے۔

پنجابی گیت

اچیاں محلاں والیے یا دے خیر فقراں نوں
اڈیاں نی کونجاں وچ اک ساڈی کونج اے"
لے وے رانجھیا واہ میں لاء تھکی مرے وس تھیں گل " بے وس ہوئی"
چھتی بھی اے ٹاہلی، بیٹھ اے بھیڑاں دا واڑ"
بھیڑاں نہیں ڈب کھڑیاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہے میں ایسے مار مکائیاں دیسوں دور کرائیاں
موت جوگے نے اور گل جو کھلا لیا
منڈیا تیری عمر کیہ اے؟"
وے توں کنے سالاں دا ایں
نی شدو تینوں سب لڑے
"بے بے تھوڑا جیہا گڑ دئے"
ہائے ہائے نی مینوں کھا گئی

غریب ترگھرانوں کے معاملات، گرے پڑے لوگوں (کوڈو فقیر، شیدو مہترانی، صادو ترکھان، باقی مسلی، ناتو سانسی، شیرو، عالمے اور پیرو) کی کہانیاں، دیہی معاشرت کی ہو بہو عکاسی، دیہاتی اور شہری زندگی کے درمیان سانس لیتے لوگوں کی ذہنی اور نفسی کیفیات کی ترجمانی، سائنسی انکشافات کے درمیان گزرنے کا عالم، لطیف جنسی نفسیات کے اظہار پر یکساں گرفت، اور ان سب کے ساتھ ساتھ مزید اردو افسانے کو محبت کی کہانیوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ اس مجموعے کے افسانے ایسے فنکار کا روپ دکھاتے ہیں جو اپنی پیش آمد کو گرفت میں لانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اور اس فن کار نے جس اختصار اور ایجاز سے کام لیا ہے اس نے ان کی کہانیوں کو اور بھی موثر بنا دیا ہے چند جملوں میں اتنے بہت سے غیر معمولی واقعات کو سمونا اور یوں آہستہ خرامی سے گزر جانا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو منشیاد کا کمال فن ہی ہے۔

Name of Journal: Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal Education & Research
Vol. 3 No.1 (2025)

رشید امجد لکھتے ہیں:

> ”ماس اور مٹی کی کہانیوں میں حقیقت نگاری ایک نیا علامتی روپ اختیار کرتی ہے۔اس کتاب کی کہانیوں میں دیہاتی پس منظر شہری ذائقہ کے ساتھ مل کر ایک عجیب رنگ پیدا کرتا ہے۔کہانیوں کی بنت کاری ہی میں زیر کی اور تخلیقی دبازت نہیں بلکہ چیزوں کو دیکھنے اور انہیں دوبارہ تخلیق کرنے کا فن بھی اپنے نقطہ عروج پر ہے سماجی مسائل کو فرد کی تنگنائے سے نکال کر پورے سماجی تناظر میں دیکھنے کا رویہ ان کہانیوں کے فکری لینڈ سکیپ کو وسیع کرتا ہے۔“ (۱۰)

حوالہ جات

٦۔مظفر علی سید، منشایاد۔۔۔کاریگر افسانہ نگار(کراچی ماہنامہ قومی زبان، جلد نمبر ٦٢، شمارہ نمبر ا، جنوری ١٩٩٠ء) ص ٥٩
٧۔اعجاز راہی، اُردو افسانے میں اُسلوب کا آہنگ(روالپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ٢٠٠٣ء) ص ١٦٢
٨۔حیدر قریشی، منشایاد کا شہر فسانہ اسلام آباد: سہ ماھی عکاس، جلد نمبر ١٥، شمار ٢٠١٥ ٣٠ جنوری ٢٠٠٨ء) ص ١٦٩
٩۔حیدر قریشی، منشایاد کا شہر فسانہ (اسلام آباد: سہ ماہی عکاس، جلد نمبر ١٥، شمارہ ١ ٢ ٣ جنوری ٢٠٠٨ء) ص ١٦٩
١٠۔رشید امجد، محمد منشایاد کی تین کتابیں (لاہور: ماہنامہ اوراق، خاص نمبر مارچ ١٩٨٦ء) ص ٣٢١